اسلامی تراث پر اسرائیلیات کے اثرات اور اس سے متعلقہ احکامات:
شرعی نقطۂ نظر سے ایک تحقیقی مطالعہ

Impacts of Israeliyaat on Islamic Literature: A research study in light of Islamic point of view

شاہد امین [i] سید ایاز شاہ [ii]

Abstract

Quran is not a story telling book, rather it is a reminder and constitution of life. When we compare it with previous heavenly books, they share some similarities-However; some differences are there too, especially in the cases of prophets and their nations. When Quran speak about the previous nations, it keeps the statement that is related to optimization and training and then it moves to appropriate location- Unlike Torah, Gospel and the Israeli literature that describes the statements from the very beginning till the very end.

In fact, one aspect of Israeliyaat is that according to the specifications of Holy Quran, Torah and Gospel have been distorted- Moreover, Israeli literature has also not reached us through authentic sources. Therefore, the blind acceptances of their instances do not match the spirit of scientific integrity and research requirements- However, as human beings want to know the details of any event, the story tellers took full advantage of this habit and presented these events in condimental manner. Therefore, several Israeliyaat impacted the interpretations of Quranic teachings.

Secondly, when fanatical crusade rulers, through their plotting against Islamic Khilafah, imposed a secular democratic system of government over Muslims, those religious scholars and researchers stood up who wanted to earn their own interest through appeasing the Judaism and crusade rulers- They took double advantages through their actions.

i پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک سٹڈیز، عبدالولی خان یونیورسٹی مردان

ii ریسرچ اسکالر، شعبہ قرآن وسنۃ، جامعہ کراچی

1: Any matter was rejected if that seems to be against the interests and objectives of solid powered rulers.
2: They would impose their points over Muslims in the back (shape) of Israeliyaat.
As well as researching and exploring their favorite traditions and historical realities and trying to make them part of the Muslim literature.

قران کریم کوئی قصّہ گوئی کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ ایک نصیحت اور دستور حیات ہے۔اس کا موازنہ جب ہم سابقہ آسمانی کتابوں سے کرتے ہیں تو ان میں کئی باتوں میں اشتراک جبکہ کئی جگہوں میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے خاص طور پر انبیاء علیہم السلام اور ان کی اقوام کے واقعات میں۔ قرآن کریم جب گزشتہ اقوام میں سے کسی کا تذکرہ کرتا ہے تو اصلاح و تربیت کے پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے واقعہ کا صرف وہ حصّہ بیان کرتا ہے جو موقع اور محل کے مناسب ہو، پھر منتقل ہو جاتا ہے۔اس واقعہ کی جزئیات جیسا کہ متعلقہ افراد کے نام، علاقہ، ملک و تاریخ وغیرہ سے بحث نہیں کرتا۔ اس کے بر خلاف تورات، انجیل اور اسرائیلی لٹریچر میں کسی واقعہ کو شروع تا آخر بیان کیا جاتا ہے۔

اسرائیلی روایات کی حقیقت کے اعتبار سے ایک پہلو تو یہ ہے کہ قرآن کی تصریحات کے مطابق تورات و انجیل میں تحریف ہو چکی ہے اور اسرئیلی روایات پر مشتمل لٹریچر بھی باوثوق ذرائع سے لوگوں تک پہنچ نہیں سکا۔اس لئے اس میں شامل واقعات کو من و عن قبول کر لینا علمی دیانت اور تحقیق کے تقاضوں سے موافقت نہیں رکھتا۔ مگر انسان چونکہ کسی بھی واقعہ کی تفصیل جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے لہذا اس کا فائدہ اٹھا کر قصّہ گو واعظین نے اسرائیلی روایات کو خوب مصالحہ لگا کر پیش کیا اور کئی اسرائیلی روایات قرآنی تعلیمات کی تشریح و تفسیر کے حوالے سے اپنا اثر چھوڑ گئیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب متعصب صلیبی حکمرانوں نے اپنی سازشوں کی مدد سے عالم اسلام کو خلافت اسلامیہ کے سایہ سے محروم کر کے جمہوری یا سیکولر نظام حکومت مسلط کیا تو اس موقع پر مذہبی دانشوروں اور محققین کی ایسی کھیپ سامنے نظر آئی جو یہودیت کی پشت پناہی اور صلیبی حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کر کے اپنے مفادات پورے کرنا چاہتے تھے۔اس سے انہوں نے دوہرا فائدہ اٹھایا۔ایک طرف تو یہ کہ اگر کوئی بات مقتدر قوتوں کے مفادات و مقاصد کے خلاف نظر آتی تو انھیں اسرائیلی روایات کا نام دے کر رد کر دیتے۔ جبکہ دوسری طرف یہودیت و عیسایت کے نکتہ نظر

کو اپنی اسرائیلی روایات کی مدد سے مسلمانوں پر تھوپ دیتے اور اپنی پسندیدہ روایات کو تحقیق و ریسرچ اور تاریخی حقائق کا نام دے کر اسلامی لٹریچر کا حصّہ بنانے کی کوشش کرتے۔

اسرائیلیات کا مفہوم

اسرائیلیات کا لفظ اگرچہ بظاہر اس یہودی تہذیب و ثقافت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تفسیر قرآن پر اثر انداز ہوئی مگر در حقیقت اس کے مفہوم میں وسعت پائی جاتی ہے لہذا اس سے مراد وہ روایات ہیں جو یہودیوں یا عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں سے بعض روایات براہ راست بائبل یا تالمود سے لی گئی ہیں۔ بعض مشنا اور ان کی شروح سے اور بعض وہ زبانی روایات ہیں جو اہل کتاب میں سینہ بہ سینہ نقل ہوتی چلی آئی ہیں اور عرب کے یہود و نصاریٰ میں معروف و مشہور ہیں[1]۔ ان کو اسرائیلیات کا نام تغلیباً دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہودیت کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور یہود سے اکثر روایات نقل ہو کر مسلمانوں میں پھیل گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کی تعداد زیادہ تھی اور وہ قوت و اقتدار میں تھے۔ مزید یہ کہ آغاز اسلام سے لیکر وہ اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ گھلے ملے رہے جب تک اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے[2]۔

یہود و نصاریٰ کی جداگانہ ثقافت

یہود و نصاریٰ ایک جداگانہ دینی ثقافت کے علم بردار تھے اور یہ دونوں تہذیبیں بڑی حد تک تفسیر پر اثر انداز ہوئیں۔

یہودی ثقافت

یہودی ثقافت کا دار و مدار تورات پر ہے جس کی مدح قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے۔

إنا أنزلنا التّوراةَ فيها هُدًى و نُورٌ[3]

"ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔"

تورات کا لفظ بول کر اس سے یہود کی تمام کتب مقدسہ مراد لی جاتی ہیں جن میں زبور بھی شامل ہے۔ تورات کو دیگر کتب موسوی کے ساتھ شامل کر کے "عہد قدیم" کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہود کے ہاں کچھ مواعظ و نصائح اور تورات کی شروح بھی تھیں جو سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر یہود تک پہنچی تھیں۔ اس پر کئی صدیاں بیتنے کے بعد ان کو مدوّن کر کے "تلمود" کے نام سے پکارا گیا۔ اس کے علاوہ

ان کے پاس یہودی لٹریچر بھی تھا جن میں واقعات و حوادث، تاریخ و تشریع اور قصے کہانیاں بھی شامل تھیں[4]۔

نصرانی ثقافت

نصاریٰ کی تہذیب و ثقافت کا دار و مدار اکثر و بیشتر انجیل پر تھا۔ قرآن کریم نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ انجیل اللہ رب العزت کی نازل کردہ ہے:

ثمّ قفّیناعلی آثارهم برُسلنا وقفّینا بعیسی ابن مریم و آتینه الإنجیل[5]

"پھر ان کے بعد ہم نے لگاتار رسول بھیجے اور پھر عیسی ابن مریم کو مبعوث کیا اور ان کو انجیل عطا کی۔"

نصاریٰ کے ہاں معتبر انجیل کے ساتھ رسائلِ انبیاء کو ملا کر "عہد جدید" کہا جاتا ہے۔ نصاریٰ کی کتب مقدسہ میں تورات و انجیل دونوں شامل ہیں۔ تورات کو عہد قدیم اور انجیل کو عہد جدید کہتے ہیں۔ انجیل کی متعدد شرحوں کے ساتھ ساتھ وہ اخبار و واقعات اور تعلیمات بھی نصرانی ثقافت و تہذیب کا سرچشمہ ٹھہرے جو کہ عیسائیوں نے از خود گھڑ کر ان کو حضرت عیسی علیہ السلام کی جانب منسوب کر دیا تھا۔ غرض یہ کہ یہود کی دینی تہذیب کا اولین سرچشمہ اگر تورات تھی تو نصاریٰ کی انجیل۔

قرآن و کتب سماویہ کے متفقہ موضوعات

قرآن کریم اور دیگر آسمانی کتب کا موازنہ کرنے سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ان کے بہت سے موضوعات و مضامین میں اتفاق ہے۔ فرق اجمال اور تفصیل کا ہے۔ قرآن مختلف واقعات کے صرف ان اجزاء کا ذکر کرتا ہے جو موضوع سے متعلق ہوں جبکہ تورات و انجیل واقعات کی تاریخ، مقامات و دیگر تفصیل بھی بتا دیتا ہے۔ مثلاً:

تورات کی مثال

حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ تورات اور قرآن کریم کے کئی مقامات پر ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی سورت البقرہ اور سورت الاعراف میں نسبتاً اس واقعہ کی زیادہ تفصیل ہے مگر کہیں یہ مذکور نہیں ہے کہ:

1. جنّت کہاں واقع ہے؟
2. آدم و حوا علیہما السلام کو کس درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا؟

3. شیطان کس جانور کے بھیس میں حضرت آدم و حوا علیہا السلام کو گمراہ کرنے کے لئے جنّت میں داخل ہوا تھا؟ وغیرہ وغیرہ جبکہ تورات میں یہ تفصیلات مذکور ہیں۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ

1. جنّت عدن کے مشرق میں واقع تھی۔
2. اس درخت کا نام "شجرہ حیات" ہے اور وہ جنّت کے وسط میں واقع تھا۔
3. جس جانور نے حضرت حوا علیہا السلام کو ورغلایا تھا وہ سانپ تھا اور اس کی سزا سانپ کو یہ ملی کہ وہ پیٹ کے بل رینگتا ہے اور مٹی کھاتا ہے۔ عہد عتیق، باب سفر تکوین، ص ۴[6]۔

انجیل کی مثال

اسی طرح انجیل میں جو موضوعات زیر بحث آئی ہیں وہ قرآن میں مختصر مذکور ہیں مثلاً حضرت عیسی علیہ السلام اور ان کے معجزات کا تذکرہ۔ البتہ قرآن نے دیگر تفصیلات سے اعراض کیا ہے جیسا کہ

1. حضرت عیسی علیہ السلام کی حسب نسب، ان کی جائے ولادت و کیفیت ولادت اور نہ ہی اس شخص کا تذکرہ کیا ہے جس کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کو متہم کیا گیا تھا۔
2. نہ ہی یہ بتایا کہ آسمان سے جو کھانا اترا وہ کس قسم کا تھا۔
3. نہ ہی ان واقعات سے بحث کی جو مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو صحت یاب کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے کے بارے میں حضرت عیسی علیہ السلام کو پیش آئے تھے۔

جبکہ انجیل نے ان تمام واقعات کی جزئیات تک کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

تفسیر میں اسرائیلیات کی دخل اندازی اور ارتقاء

ابن خلدون کا زاویہ نگاہ

ابن خلدون نے اسرائیلیات کی اسلامی روایات میں داخل اندازی کو کچھ یوں بیان کیا ہے کہ متقدمین نے جب تفسیر کی کتابوں کو مدوّن کیا تو انہوں نے صحت کی تحقیق کے بغیر روایات کو اپنی کتابوں میں لے لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل عرب نہ تو کبھی اہل کتاب رہے اور نہ ہی ان کے پاس کبھی علم رہا۔ ان پر ہمیشہ بدویت اور امیت غالب رہی۔ جس طرح بغیر پڑھے لکھے لوگوں کو کائنات کے بارے میں جاننے کا شوق اور معلومات حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے اسی طرح وہ یہ بھی جاننا

چاہتے تھے کہ یہ دنیا کیسے پیدا ہوئی؟ یہ سورج چاند ستارے کیا ہیں؟ یہ زمین اور آسمان کیسے بنائے گئے؟ وغیرہ وغیرہ۔

عربوں کے پڑوس میں پڑھا لکھا طبقہ اہل کتاب یہودیوں اور نصرانیوں کا تھا۔ عام یہودی بھی عربوں کے ساتھ بدویانہ زندگی ہی گزرتے تھے اس لئے ان کی معلومات عام عوام جیسی تھی۔ان میں قبیلہ حمیر کو گویا خصوصیت حاصل تھی جو یہودیت قبول کر چکے تھے۔ پھر اسلام آیا اور انہوں نے اسلام قبول تو کر لیا مگر ان کے ذہنوں میں پہلے سنے ہوئے قصّے اپنے حال پر باقی رہے۔ کیونکہ ان قصّوں کا تعلق احکام شریعہ سے نہیں تھا۔ان کا تعلق تخلیق عالم کی داستانوں، بادشاہوں کی جنگوں اور عربوں کی آپس کی لڑائیوں سے تھا۔ اسلام لانے کے بعد لوگوں نے اپنے آباواجداد سے سنے ان قصّوں کو مسلمانوں کی مجلسوں میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس بیان کا باعث فساد عقیدہ نہیں تھا بلکہ بطور قدیمی داستانوں کے بیان کرنا مقصود تھا۔ پھر بعد میں جب تفسیر کی کتب مرتب ہونے لگیں تو ان قصّوں کو ان موقعوں پر تفسیر میں جگہ ملی جہاں قرآن نے واقعات اور قصّوں کو مجمل طور پر بیان کیا ہے کیونکہ ان پر اعتقاد رکھنا یا ایمان لانا ضروری نہیں تھا اور نہ ہی ان کا تعلق شرعی احکام سے تھا۔اس لئے ان کی صحت کی زیادہ تحقیق نہیں کی گئی اور مفسرین نے انھیں قبول کر لیا اور کتابوں میں درج کیا۔ حالانکہ ان کا سرچشمہ وہی یہودی ہیں جو بدویانہ زندگی گزار رہے تھے۔ان کے بیان کرنے والوں تک کو پتا نہیں تھا کہ حقیقت کیا ہے اور کہاں تک یہ صحیح ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ روایتیں مشہور ہو گئیں کیونکہ ان کے بیان کرنے والے اسلام لانے کے بعد قبل عزت سمجھے جاتے رہے جیسے کہ ایسے واقعات کے راوی زیادہ تر کعب الاحبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام جیسے لوگ تھے۔اس لئے ان کی روایتوں کو قبول کر لیا گیا[7]۔

ابن خلدون کی رائے کے مطابق تفسیری اقوال کی اشاعت دو امور کی مرہون منّت ہے۔ ایک تو عربوں پر جہالت اور بداوت کا غلبہ، اسباب تکوین اور اسرار وجود کا حد سے بڑھا ہوا شوق ہے جو ہر انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عرب یہ تمام باتیں اہل کتاب سے دریافت کرتے تھے۔اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان امور کا دینی احکام سے کچھ تعلق نہ تھا اس لئے اصحاب تفسیر ان کو بلا چوں وچراں تسلیم کر لیتے تھے۔

بہر حال تفسیری اقوال کی کثرت کے اسباب صرف یہی ہوں یا کچھ اور، اس میں شک نہیں کہ کتب تفسیر میں ایسے اقوال بھرے پڑے ہیں۔

دور صحابہ

ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ تفسیر قرآن میں اسرائیلیات کا گزر عہد صحابہ میں ہونے لگا۔ جب کوئی صحابی قرآن میں مذکورہ واقعات میں سے کسی ایک واقعہ تک پہنچتا تو طبعاً اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ قرآن نے جس بات کو مجمل بیان کیا ہے اس کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے کس کی جانب رجوع کیا جائے؟ مگر اسلام میں نئے داخل ہونے والے اہل کتاب کے علاوہ اس کا شافی جواب کوئی بھی نہ دے پاتا جو اپنے ساتھ اپنی دینی ثقافت لے کر آئے تھے چنانچہ وہ نو مسلم اہل کتاب، صحابہ کو اخبار و واقعات کی تفصیل سے آگاہ کرتے تھے۔

مگر یہ بات قبل ذکر ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اہل کتاب سے نہ ہر بات پوچھتے تھے اور نہ ان کی ہر بات قبول کرتے تھے۔ ان کا سوال اکثر اس واقعے کی تفصیل سے متعلق ہوتا تھا جس کو قرآن نے مختصر بیان کیا ہے۔ اور مزید یہ کہ صحابہ اہل کتاب کی بات سن کر توقف سے کام لیتے تھے اور فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل میں اس کی تصدیق و تکذیب سے احتراز کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> "اہل کتاب کی نہ ہی تصدیق کرو اور نہ تکذیب، صرف یوں کہو کہ ہم اللہ اور اس کے نازل کردہ کلام پر ایمان لائے ہیں[8]۔"

صحابہ اہل کتاب سے عقائد و احکام کے بارے میں سوال نہیں کرتے تھے۔ صرف وہ پوچھتے تھے جس سے قرآن میں درج شدہ کسی مسئلہ کی تائید مقصود ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے انحراف کر کہ ان سے کوئی سوال کریں۔ اور نہ ہی فضول قسم اور لہو لعب باتوں کے بارے میں پوچھتے تھے مثلاً:

1. اصحاب کہف کا کتا کس رنگ کا تھا؟
2. گائے کے جسم کا وہ کون سا ٹکڑا تھا جو اسرائیلی مقتول کے جسم کے ساتھ لگایا گیا تھا؟
3. کشتی نوح کی ضخامت کتنی تھی؟ اور وہ کس درخت کی لکڑی سے بنائی گئی تھی؟

4. خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کیا تھا اس کا نام کیا تھا؟ وغیرہ۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اس قسم کے سوالات بے کار تکلّف سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ صحابہ کرام اس کو حقارت اور مذمّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور وقت کے ضیاع پر محمول کرتے تھے[9]۔"

اسی طرح جو وہ بات عقیدہ شریعت کے منافی ہو، صحابہ اس کی بھی تائید نہیں کرتے تھے البتہ صحابہ کا تو یہ عالم تھا کہ جب وہ اہل کتاب سے کوئی سوال کرتے اور وہ غلط جواب دیتے تو اس کو رد کرتے تھے اور ان کی غلطی کو واضح کرتے تھے مثلاً ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ جو مسلم حالت نماز میں اس کو پالے اور خداوند کریم سے کسی چیز کا سوال کرے تو اللہ اسے وہ چیز عطا کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کر کہ فرمایا کہ وہ گھڑی نہایت مختصر ہوتی ہے[10]۔"

علماء سلف کے یہاں اس گھڑی کی تعیین اور اس کے باقی رہنے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ اگر یہ گھڑی باقی ہے تو ہر جمعے میں ہوتی ہے یا سال بھر ایک جمعہ میں؟ اس ضمن میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کعب الاحبار رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ گھڑی سال بھر میں صرف ایک جمعہ میں ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نے ان کی تردید کی اور فرمایا کہ یہ گھڑی ہر جمعہ میں ہوتی ہے۔ چنانچہ کعب الاحبار رضی اللہ عنہ نے جب تورات کا مطالعہ کیا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی تائید کی اور اپنے نظریے سے رجوع کیا[11]۔

حضرت ابو ہریرہ نے مذکورہ بالا گھڑی کی تعین کے بارے میں جب عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ یہ روز جمعہ کی آخری گھڑی ہوتی ہے۔ جب حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ "یہ روز جمعہ کی آخری گھڑی کیونکر ہو سکتی ہے جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"جو شخص حالت نماز میں اس گھڑی کو پالے"۔ ظاہر ہے کہ دن کی آخری گھڑی میں نماز نہیں پڑھی جاتی۔ عبداللہ بن سلامؓ نے اس کا یہ جواب دیا کہ آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص اگلی نماز کے انتظار کے لئے بیٹھا رہتا ہے وہ گویا نماز ہی میں مشغول ہوتا ہے یہاں تک کہ نماز پڑھ کر فارغ ہو جائے[12]۔"

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صحابہ اہل کتاب کی ہر بات کو بغیر سوچے سمجھے تسلیم نہیں کیا کرتے تھے بخلاف اس کے وہ حق وصواب کے طلبگار تھے اور اہل کتاب کے غلط اقوال کو رد بھی کیا کرتے تھے۔ اس میں بھی شک وشبہہ نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے استفادہ کرنے کا جو دائرہ مقرّر کیا تھا، اس سے تجاوز نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ایک آیت بھی ہو تو مجھ سے آگے پہنچادو۔ بنی اسرائیل کی روایات بیان کریں اس میں کچھ حرج نہیں۔ اور جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا، اس نے اپنا گھر دوزخ میں بنالیا[13]۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اہل کتاب کی نہ تصدیق کیجیے اور نہ تکذیب۔ یوں کہئے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو کچھ ہماری طرف نازل کیا گیا[14]۔"

اوپر ذکر کی گئی دونوں روایتوں میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے مگر در حقیقت کوئی تعارض نہیں ہے۔ پہلی حدیث میں بنی اسرائیل کے ان عجیب وغریب واقعات کے بیان کرنے کی اجازت دی گئی ہے جن سے وہ دوچار ہوئے اور ساتھ ہی ان میں عبرت اور نصیحت کا کوئی پہلو بھی موجود ہو اور بالکل آزاد بھی نہیں چھوڑا گیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ واقعات کا جھوٹا ہونا معلوم نہ ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی جھوٹی روایات کے نقل کی اجازت نہیں دے سکتے۔

حافظ ابن حجر اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹی روایات بیان کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس بات کے جھوٹے ہونے کا تمہیں علم نہ ہو، بنی اسرائیل کے بارے میں وہ بیان کیجیے، کیونکہ سچی بات کے نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

دوسری حدیث بھی اس کی مانند ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اہل کتاب کی نہ تصدیق کریں اور نہ تکذیب۔ یعنی جو بات سچی اور قطعی ہو اس کی روایت کرنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا[15]۔"

دوسری حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب کی روایات میں اگر صدق وکذب دونوں کا احتمال ہو تو اس میں توقف سے کام لیا جائے کیونکہ بعض اوقات سچی بات کو جھٹلا دیا جاتا ہے اور جھوٹی بات کی

تصدیق ہو جاتی ہے جس سے نقصان ہوتا ہے۔ البتہ اہل کتاب کی جو بات ہماری شریعت کے خلاف ہو ہم اس کی تکذیب کر سکتے ہیں اور جو ہماری شریعت کے مطابق ہو اس کی تصدیق کی ہمیں کھلی اجازت ہے۔

دور تابعین

جب تابعین کا زمانہ آیا تو اہل کتاب سے نقل و روایت میں وسعت پیدا ہوئی اور کثرت سے روایات گھڑی جانے لگیں۔ اس لئے کہ عہد تابعین میں بکثرت اہل کتاب جوق در جوق اسلام لائے۔ قرآن جن واقعات کی جانب صرف اشارہ کیا گیا تھا، مسلمانوں میں ان تفصیلات سننے کا ذوق و شوق ابھرا۔ چنانچہ اس دور میں ایسے مفسرین پیدا ہوئے جنہوں نے تفسیر میں اس خلاء کو بھرنا چاہا اور اس سلسلے میں یہود و نصاریٰ سے مدد حاصل کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفسیر قرآن متضاد قسم کی قصّہ کہانیوں کا پلندہ بن گیا۔

ان مفسرین میں ایک مقاتل بن سلیمان بھی ہیں ابو حاتم نے "وفیات الاعیان" میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے قرآنی علوم یہود و نصاریٰ سے حاصل کئے اور ان کو اہل کتاب کی کتب مقدسہ کے قالب میں ڈھال دیا[16]۔

تابعین کے زمانے میں ہمیں ایسے مفسرین بھی ملتے ہیں جنہوں نے آئندہ پیش آنے والے واقعات کو قرآن کریم سے اخذ کیا۔ مثلاً مقاتل بن سلیمان کا قول ہے کہ آیت کریمہ:

و إن مِن قريةٍ إلّا نحن مُهلكوها قبل يوم القيامة أو معذّبوها عذاباً شديداً كان ذالك في الكتابِ مسطوراً

"اور کوئی بستی ایسی نہیں ہے جسے ہم روز قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا اسے سخت عذاب نہ دیں یہ بات (تقدیر کی) کتاب میں لکھی جا چکی ہے[17]۔"

اس آیت میں قسطنطنیہ کی فتح اور اندلس کی بربادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس نے قرآن کریم سے دیگر بلاد و دیار سے متعلق اشارات اخذ کئے ہیں[18]۔

دور بعد از تابعین

دور تابعین کے بعد ایسے لوگ منظر عام پر آئے جو اسرائیلیات پر دل و جان سے فریفتہ تھے اور ان سے اس حد تک شغف رکھتے تھے کہ کسی قول کو بھی رد نہ کرتے تھے چاہے وہ خلاف عقل ہی کیوں نہ ہو۔ اس شغف اور وابستگی کی کیفیت جاری رہی یہاں تک کہ اسرائیلیات نے تفریحی کہانیوں

کی صورت اختیار کر لی۔ جب تدوین تفسیر کا دور آیا تو مفسرین میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی کتب تفسیر کو اسرائیلی واقعات سے بھر دیا[19]۔

مسلمانوں میں اسرائیلی روایات کے پھیلنے کی ایک وجہ وہ قصّہ گو واعظین بھی تھے جو ان قصّوں کو لوگوں کے سامنے مذہبی رنگ میں بیان کرتے تھے اور لوگ بہت دلچسپی سے ان کو سنتے تھے۔ جب اس فتنہ نے زور پکڑا تو ان قصّہ گو واعظوں کو زبردستی مسجدوں سے نکال دیا گیا اور ان پر پابندیاں عائد کی گئیں کہ ذہنوں کو خراب کرنے والی ان روایتوں کے زہریلی اثرات سے عام مسلمانوں کو محفوظ رکھا جائے۔ حضرت علی اور حضرت عبدللہ بن عمر رضی اللہ عنھما نے بھی اپنے زمانے میں ایسے بے بنیاد اور فرضی واقعات بیان کرنے والوں کو مسجدوں سے نکلوادیا تھا[20]۔

اسی طرح تفسیر میں ہر طرح کی رطب و یابس اور صحیح و غلط باتیں آ گئیں۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، "اس کے بعد کثرت سے لوگوں نے فن تفسیر میں کتابیں لکھیں۔ سندوں میں اختصار کر دیا اور پے در پے اقوال لاتے چلے گئے، صحیح و غلط مخلوط ہو گیا۔ جس کے دل میں جو خیال آیا اس کو صحیح مان کر تفسیر میں لکھ دیا اور بعد کے لوگ اس کو صحیح سمجھ کر نقل کرتے چلے گئے اور یہ معلوم کرنے کی بھی انہوں نے زحمت نہیں کی کہ دیکھیں سلف صالحین نے اس سلسلے میں کیا لکھا ہے[21]۔

اسرائیلیات کے اثرات

ان اسرائیلی روایات نے اسلامی روایات کی پاکیزگی کو داغدار کر دیا اور مشرکانہ خیالات کی داغ بیل ڈالی۔ ان روایتوں میں کہیں خداوند قدوس کے لئے جسمانیت کا اظہار ہے اور بیشتر مقامات پر انبیاء اور رسولوں علیہم السلام کی ` عصمت مجروح ہوتی ہے۔ جن انبیاء کو یہودی تسلیم نہیں کرتے تھے ان پیغمبروں پر اتنے گندے اور گھناونے اور ناپاک الزام لگانے لگے کہ عام انسانوں پر یہ الزامات لگانا مشکل ہے۔ ان روایتوں میں کوئی بھی ایسا بدترین الزام نہیں ہے جو اللہ کے مقدس نبیوں اور رسولوں پر نہ لگایا گیا ہو[22]۔

مزید یہ کہ اسرائیلی روایات کی بھرمار کرنے والے مفسرین نے قرآن کی تشریح کرنے والوں کی راہ میں کانٹے بو دیے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان جھوٹے اور من گھڑت افسانوں کے سیلاب میں

احادیث صحیحہ کو بھی کثرت سے بہا کر لے گئے۔اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ ان سے بعض افسانوں کی نسبت چونکہ ان اہل کتاب کی جانب صحیح نہ تھی جو اسلام میں داخل ہو گئے تھے لہذا بعض لوگوں نے ان مسلم اہل کتاب کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا اور وہ ان کے ہاں متہم قرار پائے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت کعب الاحبار اور حضرت وہب بن منبہ (رضی اللہ عنھم) 23۔

اسرائیلیات کی اقسام

اسرائیلیات کا حکم بیان کرتے ہوئے مشہور محقق صاحب تفسیر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایسی روایات کی تین قسمیں ہیں اور ہر قسم کا حکم علیحدہ ہے۔

قسم اول

پہلی قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کی تصدیق خارجی دلائل سے ہو چکی ہو یا صحیح سند کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو۔ جیسا کہ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جس رفیق کا ذکر کیا گیا ہے وہ حضرت خضر تھے۔اور جیسا کہ فرعون کا غرق ہو جانا، حضرت موسی علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ اور حضرت موسیٰ کا کوہ طور پر جانا وغیرہ۔ ایسی روایات اس لئے قابل اعتبار ہیں کیونکہ قرآن کریم یا صحیح احادیث نے ان کی تصدیق کر دی ہے۔

قسم دوئم

وہ اسرائیلیات جن کا جھوٹا ہونا خارجی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے اور وہ شریعت کے معروف مسائل اور عقل سلیم سے ٹکراتی ہیں جیسا کہ یہ کہانی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام آخر عمر میں (معاذاللہ) بت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔(بائبل، کتاب سلاطین اول۔ 11:2- 13) یہ روایت اس لئے قطعاً باطل ہے کیونکہ قرآن کریم نے صراحتاً اس کی تردید فرمائی ہے۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں یہ من گھڑت کہانی کہ آپ (معاذاللہ) اپنے سپہ سالار اوریا کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ایسی روایات کو نہ قبول کرنا درست ہے اور نہ ہی انکی نقل و روایت جائز ہے۔

قسم سوئم

تیسری قسم ان اسرائیلیات کی ہے جن کے بارے میں خارجی دلائل سے نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سچی ہیں اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ جھوٹی ہیں۔ مثلاً تورات کے احکام وغیرہ۔ ایسی اسرائیلیات کی نہ تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب، بلکہ توقف سے کام لیا جائے۔ کیونکہ ان کے بارے میں محدثین نے سکوت اختیار کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی ہی روایات کے بارے میں ارشاد ہے کہ

"لا تُصدِّقوها ولا تُكذِّبوها"

"نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔"

اس قسم کی روایات کو بیان کرنا تو جائز ہے لیکن ان پر کسی دینی مسئلہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی اور نہ ہی ان کی تصدیق یا تکذیب کی جاسکتی ہے۔ اس قسم کی روایات بیان کرنے کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے[24]۔

اسرائیلیات کے بارے میں اشارۂ خداوندی

حافظ ابن کثیر مزید فرماتے ہیں کہ خود قرآن کریم نے سورہ کہف میں یہ تعلیم دی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کیا جائے۔ ارشاد ہے:

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا [25]

"اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں بعض اہل کتاب) کہیں گے کہ وہ تین ہیں اور چوتھا ان کا کتا ہے اور بعض کہیں گے کہ پانچ ہیں اور چھٹا انکا کتا ہے۔ یہ لوگ یہ سب اٹکل پچوں ہانک رہے ہیں اور بعض کہیں گے کہ وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہ دیجیے کہ میرا رب ان کی تعداد خوب جانتا ہے۔ انکو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انکے بارے میں بجز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجیے اور آپ انکے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے بھی نہ پوچھئے۔"

اس آیت میں اللہ رب العزت نے اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں اہل کتاب کی مختلف اسرائیلی روایات بیان فرمائی ہیں اور ساتھ ہی مندرجہ ذیل باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

1. اسرائیلی روایات اور ان کا اختلاف بیان کرنا جائز ہے جیسا کہ اللہ رب العزت نے بیان فرمایا۔

2. ان میں سے جو روایتیں غلط ثابت ہو چکی ہوں ان کے غلط ہونے پر تنبیہ بھی کر دینی چاہیے۔ جیسا کہ پہلے دو اقوال کو اللہ رب العزت نے "رجماً بالغیب" کہہ کر رد فرمایا ہے۔
3. جس روایات کی غلطی پر کوئی دلیل نہ ہو اس کے بارے میں سکوت اختیار کرنا چاہیے۔ جیسا کہ اللہ رب العزت نے تیسری روایت پر سکوت اختیار فرمایا ہے۔
4. ان روایات کے صدق و کذب کے بارے میں یہ ایمان رکھنا چاہیے کہ حقیقی علم اللہ رب العزت کے پاس ہے۔
5. ان روایات کے بارے میں زیادہ بحث مباحثہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔
6. ایسی روایات کی زیادہ تحقیق و تفتیش میں بھی پڑنا درست نہیں کیونکہ ان سے دنیا و آخرت کا کوئی قابل ذکر فائدہ متعلق نہیں[26]۔

نتائج

جب کسی صحابی سے بسند صحیح کوئی ایسی بات نقل ہو کر ہم تک پہنچے جس کے بارے میں شریعت خاموش ہو اور اس میں تصدیق و تکذیب کا کوئی پہلو بھی موجود نہ ہو تو اس کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں گے۔ اگر صحابی پورے وثوق کے ساتھ وہ بات کہہ رہا ہو تو وہ قسم اول کی طرح مقبول ہو گی۔ اس لئے کہ یہ ممکن نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کے باوجود صحابی نے اسے اہل کتاب سے اخذ کیا ہو۔ اور اگر صحابی وہ بات پورے جزم و وثوق سے نہیں کہتا تو بھی اس روایت کو قبول کر لینا اقرب الی الصواب ہے۔ اس لئے کہ اس روایت کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور صحابی سے سننے کا احتمال اہل کتاب سے سننے کے احتمال سے قوی تر ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ صحابہ، تابعین و اتباع تابعین کے نسبت اہل کتاب سے بہت کم استفادہ کرتے تھے۔

البتہ اگر کوئی بات تابعین سے منقول ہو کر ہم تک پہنچے تو اس میں توقف سے کام لیں گے اور اسکے صدق و کذب سے متعلق کوئی عاجلانہ فیصلہ صادر نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ اس میں اہل کتاب سے سماع کا احتمال غالب ہے۔ کیونکہ تابعین اہل کتاب سے اخذ و استفادہ کرنے میں مصروف تھے۔ مگر یہ اس صورت میں ہے جب مفسرین اس پر متفق نہ ہوں۔ بصورت دیگر اگر مفسرین اس

ضمن میں متحد الخیال ہوں کہ تابعین نے یہ روایت اہل کتاب سے نہیں لی تو اس کو اہل کتاب کی روایت قرار نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ بشرح صدر اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے گا[27]۔

حواشی وحوالہ جات

1 عثمانی، مفتی محمّد تقی، علوم القرآن: ۳۴۵، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء،

2 الذہبی، ڈاکٹر محمّد حسین، الاسرائیلیات فی التفسیر والحدیث :۱۵، مکتبہ وھبہ القاہرہ مصر،

3 سورۃ المائدہ ۵:۴۴

4 حریری، پروفیسر غلام احمد، تاریخ، تفسیر و مفسرین:۱۵۸، ملک سنز پبلشرز فیصل آباد پاکستان، ۲۰۰۰ء

5 سورۃ الحدید ۵۷:۲۷

6 تاریخ، تفسیر و مفسرین:۱۶۰

7 ابن خلدون، علامہ عبد الرحمان، مقدمہ ابن خلدون مترجم مولانا راغب رحمانی:۴۹۰، نفیس اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۱ء

8 عسقلانی، حافظ ابن حجر، فتح الباری ۸:۱۲۰، دار المعارفہ بیروت

9 دہلوی، شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر:۳۵، مکتبہ برہان دہلی، ۱۹۵۵،

10 البخاری، محمّد بن اسماعیل، الصحیح البخاری، باب الجمعہ 2: 10، جمعیۃ المکنز الإسلامی، قاھرۃ مصر، ۲۰۰۰ء

11 القسطلانی، امام احمد بن محمّد، ارشاد السّاری المعروف بشرح القسطلانی ۲:۱۹۰، دار الکتب العلمیہ بیروت

12 تاریخ، تفسیر و مفسرین:۱۶۳

13 عسقلانی، حافظ ابن حجر، فتح الباری ۶:۳۲۹، دار المعارفہ بیروت،

14 نفس مصدر ۸:۱۲۰

15 فتح الباری 6:۳۲۰

16 ابن خلدون، وفیات الاعیان وابناء ابناء الزمان 2: 568، دار صادر بیروت، ۱۹۷۲ء

17 سورۃ الاسراء ۱۷:۵۸

18 تاریخ، تفسیر و مفسرین:۱۶۷

19 ڈاکٹر رمزی نعناعہ، الاسرائیلیات واثرھا فی التفسیر: ۱۷۳، مطبوعہ دار الضیاء بیروت، ۱۹۷۰ء

20 الغزالی، امام ابو حامد محمد، احیاء علوم الدین مترجم مولانا ندیم الواجدی ۱::۵۸، دار الاشاعت کراچی

21 السیوطی، امام جلال الدین، الاتقان فی علوم القران: ۱۹۰، مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف، 1426ھ

22 اسیر ادروی، مولانا نظام الدین، تفسیروں میں اسرائیلی روایات: 27، خنیس پبلشرز کراچی

23الذھبی، ڈاکٹر محمّد حسین، الاسرائیلیات فی التفسیر والحدیث: 33، مکتبہ وھبہ القاہرہ مصر

24امام عماد الدین ابن کثیر، مقدمہ تفسیر ابن کثیر ا: 4، دار التراث بیروت، ۲۰۰۱ء

25سورۃ الکہف ۱۸:۲۱

26شیخ الاسلام ابن تیمیہ، اصول تفسیر: ۳۳، مکتبہ سلفیہ لاہور

27 نفس مصدر :۱۳